# از خلافت تا امارت

## امت مسلمہ کے لئے واجب القبول نظام

(۳)

جناب مولانا محمد عبداللہ سلیم مدرس دارالعلوم دیوبند

**امامت حکمیہ**

یہاں تک کی بحث کا تعلق تو امامت حقیقیہ سے ہے۔ لیکن امامت کی دوسری قسم امامت حکمیہ ہے۔ مناسب ہے کہ حضرت مولانا شہید علیہ الرحمۃ کے کلام سے ہی اس پر یہاں بحث ہو جائے۔ حضرت فرماتے ہیں:

"جب حضرات انبیاء علیہم السلام کے کمالات سے حقیقی مشابہت کے اندر کمی اور نقصان واقع ہو مگر ظاہری علامات اور آثارِ امامت پائے جاتے ہوں تو اس کو امامت حکمیہ کہا جائے گا۔"

**امامت حکمیہ میں فرقِ مراتب**

ظاہر ہے کہ ہر جگہ اور ہر موقع پر مذکورہ کمی اور نقصان ایک ہی پیمانہ کا نہ ہوگا، بلکہ اونچ نیچ کا ضرور کچھ نہ کچھ فرق ہوگا اسی فرق کے اعتبار سے امامت حکمیہ میں بھی فرق ہوگا، اور اسی کے لئے اگر اصولی طور پر دیکھا جائے تو چار درجے بن جاتے ہیں، اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے میٹھا پانی اور کھارا پانی کہ میٹھا

پانی اگر خالص ہے تو وہ مثال ہے نبوت اور خلافت راشدہ کی، اور اگر دونوں میں باہم آمیزش ہوجائے تو یا میٹھا پانی غالب رہے گا کہ زیادہ باذوق اور میٹھے پانی کے عادی لوگ ہی اس کے اندر ملی ہوئی شوریت کو محسوس کریں گے، یا کھارا پانی زیادہ ہوگا تو ہر آدمی اس کو محسوس کرے گا اور زائد کام تو اس ہی پانی سے لیں گے لیکن کھانے پینے میں اس کو استعمال نہ کیا جاسکے گا اور ایک درجہ یہ کہ کھارا پانی اتنا غالب ہوگیا کہ مٹھاس کا نام ونشان باقی نہیں رہا اور لوگ اس کو کسی کام میں بھی نہیں لاتے حتیٰ کہ زمینوں کی سیرابی کے لئے بھی اس کو کارآمد نہیں سمجھا جاتا۔

اسی طرح (۱) امامِ وقت اگر ایسا ہو کہ جذبات بعض دفعہ نفس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے جوش مارتے ہیں۔ ذاتی اغراض وخواہشات کسی دوسرے اقدام اور فیصلہ پر برانگیختہ کرتی ہیں۔ لیکن خوفِ خدا، فکرِ آخرت، احساس مسئولیت اس کی دستگیری کرتی ہے اور حدود شرع کی خلاف ورزی نہیں کرپاتا، حُبِ جاہ ومال کے تقاضے اور عیش وعشرت کے کام مباحات کے دائرے میں رہ کر کرتا ہے تو یہ سلطنت عادلہ ہے، اس سلطانِ عادل کے احکام اسی طرح نافذ العمل ہوتے ہیں جس طرح خلیفۂ راشد کے۔ اسی کے ساتھ یہ نکتہ بھی پیش نظر رہے کہ اگرچہ باطناً کمالات نبوت سے مشابہت نہ ہونے کی وجہ سے امامت حقیقیہ نہیں لیکن ظاہر میں چونکہ شریعت کا پاس لحاظ برقرار ہے اس لئے اگر ایسے امام وقت کے دور میں کوئی ہستی ایسی ہو جس میں امامت حقیقیہ کی صلاحیت موجود ہو تو اس کو بھی امامِ وقت کی امامت کو تسلیم کرنا چاہئے اور اپنی امامت کے اعلان کے ساتھ اس کے قیام کی خاطر لوگوں کو برانگیختہ کرکے کسی فتنہ میں مبتلا نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ اسی وجہ سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے امام وقت کے حق میں دستبرداری کا معاملہ فرمایا تھا، اور بارگاہ نبوت سے پہلے ہی اُن کے اس حُسنِ عمل کی تعریف وتوصیف ہوچکی تھی کہ اُن کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو فرقوں کے درمیان برپا ہونے والے فتنے کا درماں ہوسکے گا۔

(۲) دوسرے یہ کہ جو تخت حکومت پر متمکن ہے اس پر لذائذ نفسانی کی طلب اور راحت جسمانی کی خواہش کا اس درجہ غلبہ ہے کہ گاہ بگاہ ظاہر شرع کی حدود سے بھی باہر آجاتا ہے اور بے باک فاسقوں اور سفاک ظالموں کا راستہ اختیار کر لیتا ہے اور پھر نادم ہو کر توبہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ تاہم مسلمان بحیثیت مسلمان کے اس کی سلطنت سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں اور کسی نہ کسی طرح وہ اپنے دین کو سنبھالے ہوئے ہیں تو یہ سلطنت جابرہ ہے، اس کے سلسلے میں باشندگان ملک کو یہ حکم ہے کہ اگر احکام مخالف شرع نہ ہوں تو ان کی تعمیل کی جائے، اور تاوقتیکہ شریعتِ مطہرہ سے متصادم قوانین اور ہدایات نہ جاری کرے اس کی مخالفت نہ کی جائے اور اس کے ظلم و تعدی کو بلائے آسمانی سمجھتے ہوئے اس کی اصلاح حال کے لئے بارگاہ ایزدی میں دعا کی جائے، اور بس، اس لئے کہ سلطان جابر جبکہ خود کو مسلمانوں کا ایک فرد سمجھتا ہے تو کبھی نہ کبھی اسلامی حمیت اور دینی غیرت میں جوش آسکتا ہے۔ اور اعلائے کلمہ کے لئے کسی جد و جہد میں پیش قدمی کر سکتا ہے، اس طرح دینِ متین کی تائید و نصرت ہو جاتی ہے

| | |
|---|---|
| قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان اللہ لیؤید ھذا الدین بالعبد الفاجر | جناب نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالےٰ اس دین کی تائید و نصرت ایک فاجر بندے سے بھی کرا دیتا ہے۔ |

سلطان فاجر کو مناسب اور مفید انداز میں نصیحت اور امر بالمعروف تو کیا جا سکتا ہے لیکن خروج و بغاوت اور مخالفت جائز نہیں ہے۔

| | |
|---|---|
| قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم الا من ولی علیہ دال فراٰہ یاتی شیئاً من معصیۃ اللہ فلیکرہ ما یاتی من معصیۃ اللہ ولا ینزعن یداً من طاعتہ[۱] | نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ مگر وہ شخص کہ کہ اس کو ملک کا حاکم بنایا گیا اور پھر دیکھا کہ وہ خدا کی نافرمانی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی اس معصیت کو ناگوار سمجھنا چاہیے مگر ہرگز اس کی |

[۱] منصب امامت ص ۹۱ -

اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچا جائے۔

(۳) تیسرے یہ کہ نفس کی پیروی میں اتنا بے باک ہو جائے کہ عیاشی اور فسق و فجور میں نامی گرامی سمجھا جانے لگے اور تعیش کی نئی نئی راہیں تجویز کر ڈالے، ظلم و تعدی دن رات کا مشغلہ اور جبر و تکبر اس کا شعار بن جائے۔ جادۂ سنّت اور مصالح ملت کے علی الرغم فسق و فجور اور ظلم و جور پر مبنی آئین و دستور نافذ کرے، اور ان باتوں کو وہ بجائے عیب اور نقصان کے ہنر اور کمال سمجھے تو یہ سلطنت ضلالت ہے۔ ایسی فاسقانہ اور ظالمانہ سلطنت ملک و ملت کے لئے بلاشبہ بڑی مصیبت ہے۔ اربابِ دیانت و فراست کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ ان متسلط حکام و امراء سے دور ہی رہیں۔ کیونکہ ان کی نزدیکی میں لازمی طور سے دین و ایمان کی سلامتی معرضِ خطر میں پڑ جاتی ہے۔ بیجا مدح سرائی اور باطل نوازی اور حق پوشی جیسی منافقانہ حرکتوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ حاکمِ وقت کی رضاجوئی کی خاطر طیّ مصالح کی قربانی احکام شرعیہ کی غلط تاویل و ترجمانی تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں کم از کم یہ ضروری ہے کہ اپنے دین و ایمان کی سلامتی کی فکر کی جائے اور ہر طرح کے قرب و تعلق سے محتاط رہا جائے۔ یہ سمجھنا کہ نزدیکی کی صورت میں معاشی فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ اور دین کا کچھ نقصان نہ ہوگا، یہ خیال باطل ہے۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں
ایں خیال ست و محال ست و جنوں

مگر چونکہ ایسے سلاطین خود کو ظاہراً مسلمان ہی قرار دیتے ہیں جس کا اظہار اسلامی ناموں کے رکھنے، عقدِ نکاح اور ختنہ نیز عیدین میں زیب و زینت اور تجہیز و تکفین و نماز جنازہ اور مقابر مسلمین میں تدفین وغیرہ سے ہوتا ہے تو ان وجوہ سے ان کو خارج از اسلام بھی قرار نہیں دیا جائے گا۔ بلکہ ان کے ساتھ معاملہ اہل بدعت و ضلالت کا کیا جائے گا، یعنی ان کی تکفیر میں جیسے اختلاف ہے ایسے ہی ان کی تکفیر میں بھی اختلاف ہوگا اور محل اختلاف میں احتیاط

لازم ہے اس لئے توقف واجب ہوگا، از خود ان کی مخالفت و منازعت پر کمربستہ نہ ہوں۔ اور جو اس مقصد کے لئے میدان میں مصروف کار ہوں ان پر طعن بھی نہ کیا جائے۔

**سلطنت ضلالت کے بارے میں شاہ ولی اللہؒ کا ارشاد**

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہٗ بھی یہی بات تحریر فرماتے ہیں کہ

"اگر ایسا شخص برسر حکومت آجائے جس میں شرائط امامت نہ پائی جاتی ہوں تو بھی اس کو تخت سلطنت سے ہٹانے کی جدوجہد میں نہ کود پڑنا چاہیئے، اس لئے کہ یہ بغیر لڑے بھڑے نہیں ہوسکتا، اور یہ بات مصالح کے مقابلہ میں زیادہ سخت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی دریافت کیا گیا تھا کہ کیا ہم ایسے صاحب حکومت کی مخالفت نہ کریں۔ تو آپؐ نے فرمایا تھا نہیں! جب تک وہ تم میں نمازیں قائم کراتا ہے۔ اور ایک روایت میں یہ جواب گرامی ہے کہ۔ ہاں اس وقت مخالفت کی جاسکے گی جبکہ تم اس سے علانیہ کفر دیکھو اور اس کے معاملہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لئے حجت ہو۔[1]"

اور سلطانِ وقت کے دعوائے اسلام کی وجہ سے ہی اس کی سلطنت کو از اقسام امامت شمار کیا جائے گا لیکن اس سلطان کے لئے امام کا لفظ نہیں بولا جائے گا[2] کیونکہ یہ لفظ اسی مسلمان صاحب حکومت کے لئے بولا جاتا ہے جو خود بھی اسلامی احکام پر عمل پیرا ہو اور تقویت اسلام کے لئے اور تہدید کفار کی خاطر علم جہاد بلند کرے اور شریعت مطہرہ کی ہر نوع اعانت پر کمربستہ رہے، مخلوق خدا کی راحت رسانی کو اپنا فریضہ قرار دے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۱۵۰ جلد دوم

[2] منصب امامت ص۹۶

اور اگر سلطان اس مبنی بر ضلالت آئین وطرز حکومت کا موجد یا مجدد نہیں ہے بلکہ دل سے متنفر ہونے کے ساتھ سابقہ دیرینہ معمول کی پاسداری کی خاطر ان پر عمل پیرا ہے تو نوعیت میں اور بھی تخفیف ہوجاتی ہے، ہاں اگر یہ بات یقینی ہو کہ اس سلطان مضل ومبتدع کے ہٹا دینے اور کسی بھی صورت سے اقتدار محروم کر دینے کی صورت میں خلافت راشدہ یا سلطنت عادلہ کے قیام کا ظن غالب ہے تو اقدام جائز ہوگا۔

(۴) چوتھے سلطنت کفریہ ہے۔ لیکن اس کے معنیٰ اصلی کافروں کی حکومت کے نہیں ہیں بلکہ ایسے سلطان وقت کی حکومت کے ہیں جو خود کو زمرۂ مسلمین میں شمار کراتے ہوئے کفر صریح کے موجبات پر عمل کرے، کھلے عام خلافِ شرع احکام نافذ کرے اور ملت اسلامیہ کے شعائر اور سنن نبوی پر ردّ و قدح اور ان کے ساتھ استہزاء واہانت کا برتاؤ کرے اور ان کے مقابلے میں اپنے آئین ودستور اور نظامِ مملکت کے محاسن شمار کرائے، اور اس طرح وہ الحاد وزندقہ کی بنیاد رکھدے۔ اس کے نزدیک دنیوی نشیب وفراز ہی میں اصل سعادت وشقاوت ہو اور انبیاء اللہ اور ہادیان راہ حق کو وہ عقلاء جاہ طلب کی جنس سے اور ان کے متبعین اور پیروکاروں کو احمق و بیوقوف شمار کرے۔ جو ایک گوشہ میں ذکر وفکر اور تعلیم وتعلم میں توکل وقناعت کے ساتھ مصروف ہوں ان کو ناتواں اور عاجز اور بیکار سمجھے، ایسی سلطنت امامت کے ذیل میں قطعاً نہیں آتی، مگر اس کو اس جگہ اس لئے بیان کر دیا گیا کہ بعض مسلمان کہلانے والے اس حد تک بھی گستاخ ہوجاتے ہیں اور ان کے ذریعے سے بجائے تقویت اسلام کے ترویج کفر وضلالت ہوتی ہے تو اس کی مخالفت دین کی تائید اور اس کے خلاف جہاد کی کوشش کرنا تقاضائے ایمان ونصرت شریعت مطہرہ ہے۔

| | |
|---|---|
| کما رواہ عبادۃ بن الصامت انہ | جیسا کہ حضرت عبادہ بن صامت نے روایت |
| قال بایعنا رسول اللہ صلے اللہ علیہ | کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم |
| وسلم علی ان لا ع الامر اھلہ | سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ نہیں ہٹائیں گے |

الا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللہ فیہ برھان[1]

ہم حکومت سے اس کے اہل کو۔ مگر یہ کہ دیکھ لو تم علانیہ کفر اور اس کے بارے میں تمہارے پاس اللہ کے لئے کوئی قوی حجت ہو۔

**انتخاب امیر** اب ہمیں انتخاب امیر کے مسئلہ سے بحث کرنی ہے کہ کیا خلیفہ اور امیر المومنین کا تقرر منجانب اللہ ہوتا ہے گویا جس طرح نبی اور پیغمبر کی بعثت ہوتی ہے اور اس میں کسی کسب و محنت کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح خلیفہ کا تقرر بھی قدرتِ خداوندی براہ راست کرتی ہے یا امت کو اپنے ارادہ و اختیار تمیزی کو کام میں لاکر انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

**اکبر شاہ نجیب آبادی کا نقطۂ نظر** اس سلسلے میں بعض حضرات نے پہلی بات کو ترجیح دی ہے۔ چنانچہ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی نے اپنی کتاب تاریخ الاسلام میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) خلافت کے معنیٰ جانشینی اور خلیفہ کے معنیٰ جانشین کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ شرع میں خلیفہ کے معنیٰ بادشاہ کے قریب مراد لئے جاتے ہیں۔

(۲) قرآن پاک میں جہاں جہاں لفظ خلیفہ آیا ہے اس کے ساتھ الارض کا لفظ بھی ضرور آیا ہے۔ جیسے انی[1] جاعل فی الارض خلیفۃ، ھو[2] الذی جعلکم خلائف فی الارض، ھو[3] الذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجات، یا[4] داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض، وعد[5] اللہ الذین آمنوا وعملوا الصلحات لیستخلفنھم فی الارض[2]

---

[1] منصب امامت ص۹۷

[2] ترجمہ آیات: ۱ میں بنانے والا ہوں زمین میں نائب ۲ اسی نے بنایا تم کو زمین میں خلیفہ ۳ وہ وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور بڑھا دئے تم میں سے بعض کے بعض پر درجے ۴ اے داؤد ہم نے بنایا تجھکو زمین میں خلیفہ ۵ اللہ تعالیٰ نے (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۳) زمین اور اس کی ہر چیز کا خالق و مالک اللہ تعالےٰ ہے اور اسی کی اصل حکومت و اقتدار ہے۔ لیکن انسان کے لئے ہر چیز کو مسخر کر دیا اور وہ ہر زمینی مخلوق سے فرمانبرداری کرا لیتا ہے اس لئے خلافت کے معنیٰ زمین پر حکمرانی کے ہیں۔

(۴) اللہ تعالےٰ نے اعطائے خلافت کی نسبت ہر جگہ اپنی طرف کی ہے۔ مجازاً بھی اس کو کسی اور کی طرف منسوب نہیں کیا۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ خلافت کا منصب عطا ہونا یا اس سے محروم کرنا بلاشرکت غیرے اللہ تعالےٰ کا اپنا اختیاری فعل ہے۔ قل اللّٰھم مالك الملك تؤتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء[1]۔

(۵) چونکہ اعطاء خلافت اللہ تعالےٰ کا فعل ہے اس لئے جو جس ترتیب سے خلیفہ بنا وہ بعطائے الٰہی ہی بنا جو برحق ہی تھا۔ نہ اس میں ظلم ہوا نہ سلب حق۔ ورنہ ان برائیوں کی ذمہ داری اللہ تعالےٰ پر (معاذ اللہ) آجاتی ہے۔

(۶) آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر مسئلہ کی وضاحت فرمادی تھی لیکن مسئلہ خلافت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا، جس کی وجہ یہی ہے کہ خلیفہ کا تعین اللہ تعالےٰ کی طرف سے ہوتا ہے[2]۔ حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے بھی ایک جگہ ایسا جملہ تحریر فرمادیا ہے کہ جس سے یہی نظریہ مفہوم ہوتا ہے۔ "پس امامت فی الحقیقت از عطایائے ربانی است[3]۔"

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وعدہ کیا ہے تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے کہ ضرور ان کو خلیفہ بنائے گا وہ زمین میں۔

[1] ترجمہ: آپ کہہ دیجئے کہ اے اللہ مالک الملک تو دیتا ہے ملک (وحکومت) جس کو چاہتا ہے اور چھین لیتا ہے ملک جس سے چاہتا ہے اور تو عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ذلت دیتا ہے جسے چاہتا ہے

[2] تاریخ اسلام جلد دوم مسئلہ خلافت راشدہ۔ از مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی

[3] منصب امامت ص ۵۴

**تردید مع دلائل**

مگر ظاہر ہے کہ اس نظریہ کو ماننے کی صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ پھر قیام خلافت اور فطری و دینی حکومت کو قائم کرنے کی خاطر کسی بھی جدوجہد کے لئے کوئی مکلّف نہیں رہا، اور صبر کر لینا چاہیئے کہ چونکہ اللہ تعالےٰ نے کسی خلیفۂ راشد کو مبعوث نہیں فرمایا، اس لئے اب خلافت قائم ہی نہیں ہو سکتی۔

**امت سے قیام خلافت کا مطالبہ**

ہم سابق میں حضرت مولانا اسماعیل شہید علیہ الرحمۃ کی تحقیق مع دلائل کے نقل کر چکے ہیں جس سے ثابت ہے کہ خلافت راشدہ کا سلسلہ منقطع ضرور ہوا ہے لیکن مختتم نہیں ہوا، اور یقیناً شریعتِ اسلامیہ ہر دور میں پیغمبر کی نیابتی حکومت یعنی خلافت کے قیام کا امت سے مطالبہ کرتی ہے، اس لئے کہ ہزاران ہزار مسائل اسی دینی حکومت سے وابستہ ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ نصف دین کی بقاء اور اسلامی شوکت و قوت کا تعلق فطری حکومت سے ہی ہے۔

**حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ارشاد**

جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہٗ العزیز تحریر فرماتے ہیں:

"یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ مسلمانوں پر یہ بات واجب ہے کہ ان کے اندر ایک خلیفہ موجود ہو کیونکہ اس کی موجودگی کے بغیر وہ مصلحتیں پوری نہیں ہوتیں جن کی تعداد بہت زیادہ ہے تاہم اصولی طور پر ان کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

ایک قسم تو وہ ہے جس کا تعلق شہری اور ملکی سیاست سے ہے، جیسے اسلامی لشکر کی بہم رسانی، جو (اسلام اور نظام اسلام کی مدافعت میں) جہاد کر سکے اور ظالم کو مظلوم سے روکنا۔ اسی طرح قضا اسلامی (یعنی نزاعات کا بطریق شرعی تصفیہ کیلئے عدالتوں کا قیام)

دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق قوم و ملت سے ہے، یعنی مذہب اسلام کا

عروج اور ترقی اور اس کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ مسلم اقوام میں ان کا خلیفہ برسر حکومت ہو تاکہ مسلمانوں کے اجماع اور اجتماع کے علی الرغم رویہ اپنانے والے اور منصوص چیزوں کو کسی مقابل عقیدہ کے تحت چھوڑنے والے اور محرمات کو منصوصات کا درجہ دینے والوں کا مناسب بندوبست کرسکے۔"[1]

خلافت کی اہمیت کا مزید اندازہ اس بات سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ بنی آدم کے مقصد تخلیق یعنی عبادات میں سب سے زیادہ اہمیت نماز کو حاصل ہے، نماز کی اس اہمیت کے اعتبار سے اس کی امامت کی رفعت وعظمت واضح ہے۔ لیکن فقہاء کہتے ہیں کہ نماز کی امامت امامت صغریٰ ہے اور امت کی سیاسی امامت امامت کبریٰ۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ سیاسی امامت اور خلافت کا منصب ایک عظیم ترین مذہبی فریضہ کی امامت سے بلند تر ہے۔[2]

آخر کوئی تو وجہ تھی کہ جن مقدس حضرات صحابہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا صدمہ پہاڑ سے زیادہ بھاری بنا ہوا تھا وہ سب ہی آپؐ کی تدفین سے فراغت کا انتظار کئے بغیر خلافت کے مسئلہ کو نمٹانے میں لگ گئے۔

**مولانا اکبر شاہ کے دلائل کا جواب**

رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اعطائے خلافت کی نسبت ہر جگہ اپنی ہی طرف کی ہے، اور مجازاً بھی اس فعل کو دوسرے کی طرف منسوب نہیں کیا تو اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ جب اسباب کے دائرہ سے ہٹ کر مسبب الاسباب کی طرف نسبت کرکے کوئی بات کہی جاتی ہے تو اسی طرح کہی جاتی ہے، لیکن جب اسباب کے دائرے میں اس کو رکھا جائے تو پھر اس کی نوعیت وہی ہوجاتی ہے جو سلسلۂ اسباب

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ۔ عربی۔ جلد دوم ص۱۴۸ ابواب سیاست المدن ۱۲

[2] اسلام کا نظام حکومت ص۳۳۸ بحوالہ احکام القرآن للجصاص و ص۲۴۳ بحوالہ مقدمہ ابن خلدون

سے منسلک کسی بھی دوسری بات کی، ـــــ دیکھئے :

قرآن حکیم میں اللہ تعالے نے جس طرح نزول قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے اسی طرح حفاظتِ قرآن کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے :

انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون — ہم ہی نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اصل محافظ اللہ تعالے ہی ہیں، اگر اس کی طرف سے حفاظت کا غیبی بندوبست نہ ہوتا تو کتب سابقہ جیسا معاملہ کرنے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی تھی لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ عالم اسباب میں اس کی حفاظت کا جو بندوبست کیا گیا ہے اس کا تعلق انسانوں کے اپنے فعل و عمل سے نہیں ہے۔ ہزاروں لاکھوں لڑکے اور لڑکیاں اس کو اپنے سینہ میں محفوظ کرتے رہتے ہیں اور قرآن پاک کے اسی حفظ و حفاظت کے لئے مسلمانوں کو مکلف بھی قرار دیا گیا ہے اس کے علاوہ ایسے سینکڑوں علوم معرض وجود میں آگئے جن کا تعلق الفاظ کی قرارت اور کتابت سے ہے۔

بالکل اسی طرح خلیفہ کا معاملہ ہے کہ اس کے لئے کسی فرد میں امامت کبریٰ کی صلاحیت کا پیدا کرنا اور پھر اس کی صلاحیتوں کو نمایاں کر کے اس کی طرف عوام و خواص کے قلوب کو متوجہ کرنا اسی کا کام ہے۔ لیکن اسباب کے درجہ میں یہ کام لوگوں کا ہی ہے کہ وہ صلاحیت مند فرد کو تلاش کریں اور اس کو اپنا خلیفہ چن لیں۔ یہ بات فیصلہ خداوندی اور اس کی طرف سے نامزدگی سے متصادم نہیں ہے، اور یہ ٹکراؤ یہاں اسی طرح نہیں ہے جیسے اس بات سے نہیں ہے کہ

اعمالکم عمالکم — کہ جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے ہی تمہارے حکام بھی ہوں گے۔

بہرحال ترجیح اسی بات کو ہے کہ کسی کو خلیفہ بنانا یہ لوگوں کا اپنا فعل ہے، اور اس میں

ان کے اختیار تمیزی کو پورا پورا دخل ہے۔

**طریق انتخاب** اب یہ بات بحث طلب ہے کہ انتخاب خلیفہ کا طریق کار کیا ہو۔ کیا اس کے لئے شریعت نے کوئی رہنمائی دی ہے یا نہیں؟

تو قرآن وحدیث نے تو اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی البتہ خلفاء راشدین کے انتخاب کے سلسلے میں جو طریق عمل اپنایا گیا اس کو شریعت اسلامیہ میں قانونی نظیر کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، اس لئے کہ خلفاء راشدین سے ثابت شدہ یا ان کے منظور کردہ عمل کو بھی مندرجہ ذیل ارشاد رسولؐ کے مطابق آئینی حیثیت حاصل ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔

تم پر میری سنت کی اور ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کی پیروی واجب ہے۔

**حضرت شاہ ولی اللہ کی تحقیق** تو خلفاء راشدین کو خلافت کے لئے کیسے چنا گیا اس کے لئے حجۃ اللہ البالغہ سے یہ تفصیل مختصر الفاظ میں ملتی ہے:

"خلافت کا انعقاد چند طریقوں سے ہوتا ہے۔

(۱) علماء رؤساء اور فوجی افسران میں سے اُن اہلِ حلّ وعقد کی طرف سے بیعت جو صاحب الرائے بھی ہوں اور مسلمانوں کی ہمدردی بھی ان کے دلوں میں ہو جیسے سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد عمل میں آیا۔

(۲) برسر اقتدار خلیفہ اپنے بعد خلافت کے لئے کسی فرد کی وصیت کر دے جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی تھی۔

(۳) عوام کے معتمدین میں سے کچھ افراد کی مجلس شوریٰ بنا دی جائے وہ اتفاق رائے سے کسی کو خلیفہ مقرر کر دیں جیسے حضرت عثمان بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہما کے

انعقادِ خلافت کے وقت ہوا تھا۔

(۴) شرائط خلافت کی حامل کسی شخصیت کا از خود لوگوں کے اقتدار کو سنبھال لینا، جیسے خلافتِ نبوت کے بعد کے خلفاء نے کیا۔"[1]

مگر شاہ صاحبؒ کی تحریر فرمودہ اس تفصیل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بھی میر اور حاکم کو منتخب کرنے کی یہی چار صورتیں ہو بھی سکتی ہیں پانچویں کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ شریعت نے اس کے بارے میں کوئی ضابطہ مقرر نہیں کیا، کیونکہ اصل مقصود شرائط کی حامل اور منصب کی اہل شخصیت کا برسر اقتدار لانا ہے خواہ وہ کسی بھی طریقے سے ہو، اسی لئے طریق انتخاب کے سلسلہ میں شریعت نے کوئی متعین صورت تجویز نہ کرتے ہوئے حالات اور ماحول کے حوالہ کر دیا کہ قوم و ملک کو کسی فتنہ میں مبتلا کئے بغیر جس طرح بھی اہل شخص کے ہاتھ میں زمام حکومت آجائے بہتر ہے۔

**اسلام اور جمہوریت**

موجودہ صدی کے بعض اہل قلم نے خلافت راشدہ یعنی اصل اسلامی حکومت کے نظام اور امیر کے انتخاب کی تعبیر میں بہت بڑی تبدیلی کی ہے اور اس کا پس منظر یہ ہے کہ ان حضرات کا ذہن اس بات سے دباؤ محسوس کرتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کو کوئی اس دور میں مبغوض قرار پانے والی شخصی حکومت کے مماثل نہ قرار دیدے اسی وجہ سے ان کو یہ بحث بھی کرنی پڑی ہے کہ آخر اسلام کا نظامِ حکومت کیا تھا، شخصی یا جمہوری؟ کیونکہ اگر جمہوری ثابت ہو جائے تو یہ بات خود بخود مسلّم ہو جائے گی کہ انتخاب امیر جمہوری طریقے کے مطابق ہی ہوا تھا۔

**ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا نقطۂ نظر**

تو اسی وجہ سے جدید اسلوب سے لکھنے والے بعض اہلِ قلم حضرات کی یہ جد و جہد جاری ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت کو جمہوری ثابت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ صـ ۱۴۹

کیا جائے۔ بعض لوگ تو صراحۃً دعویٰ کر ڈالتے ہیں، لیکن بعض دوسرے حضرات لفظوں میں تو یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا نظام حکومت نہ شخصی ہے اور نہ جمہوری، لیکن نظام کی تشریح اور تعبیر کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ تاثر ملے کہ جمہوری نظام بھی تو یہی ہے، اور پھر جمہوری ہونے کی راہ میں جتنی رکاوٹیں سامنے آئیں ان پر رد و قدح کرتے ہیں ــــ ان ہی میں سے عالمِ عرب کے مشہور صاحب قلم ڈاکٹر طہٰ حسین ہیں، اپنی کتاب الفتنۃ الکبریٰ میں بڑی اچھی اور کارآمد بحثوں کے دوران یہ بھی کہا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی حکومت کا نظام الٰہی نہ تھا، دلیل یہ ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو آپؐ کو مشورہ کی ہدایت ہرگز نہ دی جاتی، ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے:

"خدا نے اپنے پیغمبر کو ہدایت دی کہ وہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کیا کریں۔ اگر حکم کا تعلق آسمان سے ہی ہوتا تو آنحضرتؐ خدا کے حکم کے موافق ہر بات کو بغیر کسی مشورے کے خود نمٹا لیتے۔"

نیز غزوۂ احد کے موقع پر آنحضرتؐ کا خیال تھا کہ مدینہ ہی میں قیام کیا جائے اور حملہ ہونے کی صورت میں مدافعت کی جائے۔ لیکن حضرات صحابہ اور خصوصاً انصار نے باصرار مشورہ دیا کہ دشمن سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ آپ نے ان کی بات مان کر جب تیاری کر لی تو اس دوران صحابہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ہم نے اللہ کے نبی کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کیا ہے۔ تو ندامت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ جو حضرت کی منشاء ہو اس کے مطابق کیا جائے۔ لیکن آپ نے انکار فرمایا اور جو مشورہ دیا جا چکا تھا، اسی پر جمے رہے۔

"اگر الٰہی نظام ہوتا اور ہر معاملہ میں نزول حکم آسمان سے ہی ہونا ضروری ہوتا تو حضرات صحابہؓ آنحضرتؐ کو مجبور نہ کر سکتے تھے اور نہ ہی آپؐ ان کا مشورہ قبول فرماتے۔"

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر فیصلہ کا اصل اور حقیقی مدار حضرات صحابہ کے مشورہ پر تھا تو آپ کو ناگواری کیوں ہوئی؟ پھر آپ کا جواب صحابہ کی معذرت پر روایات میں اس طرح ہے کہ جب پیغمبر مسلح ہو جاتا ہے تو جہاد پر جائے بغیر اسلحہ نہیں اتارے جایا کرتے۔ سوچئے اس جواب میں اور اُس بات میں کہ صحابہ کے مشورے پر ہی جمے رہے بڑا فرق ہے۔

**آنحضرت کے مشورے**

آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہدایت قرآنی وشاورہم فی الامر کے مطابق بلاشبہ اکثر و بیشتر امور میں حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب فرمایا کرتے تھے۔

لیکن یہ مشورہ ان ہی چیزوں میں ہوتا تھا کہ جس میں وحی نے صراحتہً حکم دیکر کوئی رخ متعین نہ کر دیا ہو جس کا حاصل یہی ہے کہ فروعی معاملات میں مشورہ لیا جاتا تھا، کیونکہ معاملات کی بنیاد اور اس کی روح بذریعہ وحی منکشف ہو جاتی تھی، چنانچہ خود ڈاکٹر صاحب موصوف بھی تحریر فرماتے ہیں کہ

> "آنحضرتؐ کے دور میں احکام کا نزول پوری تفصیل کے ساتھ نہیں ہوتا تھا، بلکہ وحی خداوندی آکر آنحضرتؐ کو اور آپ کے صحابہ کو عام خاص مصالح کی طرف متوجہ کر دیتی تھی۔"

لیکن اس کے یہ معنی ابھی نہیں ہیں کہ فروعی معاملات میں آپؐ منشاء ربانی سے بے خبر رہتے ہوں اور اسی لئے آپ مشورہ کے ضرورتمند رہتے ہوں۔ بظاہر تو آپؐ مشوروں کے ذریعے سے فیصلے فرماتے تھے لیکن اُن فیصلوں کی حقیقی اساس مشورے ہرگز نہیں ہوتے تھے۔

**مشوروں کی نوعیت**

مشورے کا حکم بلاشبہ آپؐ کو بھی تھا اور امت کو بھی ہے لیکن مشورہ لینے میں آپ کی اور افراد امت کی حیثیت یکساں ہے ایسا سمجھنا بالکل غلط

ہے، امت کو مشورے کی ہدایت اس لئے ہے کہ غیر واضح امور میں حق کی طرف رہنمائی کے لئے وہ محتاج ہیں اور ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ مختلف رائیں سامنے آجائیں اور پھر باہمی غور و فکر کے نتیجہ میں حق کو متعین کرنا سہل ہو جائے، ظاہر ہے کہ آپؐ کی نوعیت یہ نہیں تھی اور نہ آپ اس حیثیت سے مشورہ لیتے تھے، اس لئے کہ آپ کی رہنمائی کے لئے سب سے زیادہ قطعی اور یقینی ذریعہ وحی تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کے اجتہاد یا مشورہ کے نتیجہ میں کئے گئے فیصلہ میں کوئی بات منشائے ربانی کے مطابق نہ ہوتی تو فوراً آپؐ کو اس سے متنبہ کر دیا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا مشورہ لینا تین وجہ سے ہوتا تھا،

(۱) امت کو مشورہ کی اہمیت کا احساس ہو اور وہ معاملات میں خود کو مشورہ کا عادی بنالیں۔

(۲) جماعتِ صحابہ کے ہر فرد کو فیصلوں کو قبول کرنے اور پھر تعمیل کرنے میں اطمینان قلبی حاصل ہو جائے۔

(۳) مختلف قبائل پر مشتمل قوم کی ان کے سرداروں کے مشورے کے ذریعہ دلجوئی۔

(باقی)


# قرآن اور تصوّف

مولفہ جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب مرحوم

تصوف اور اس کی تعلیم کا اصل مقصد عبدیت اور الوہیت کے مقامات اور ان کے ربط و تعلق کا حصول ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ مختلف قسم کی ذلتوں کا چشمہ بن گیا ہے۔ مؤلف نے کتاب و سنت کی روشنی میں تمام الجھنوں اور نزاکتوں کو نہایت دل نشیں اور عالمانہ پیرایہ میں واضح کیا ہے۔ قیمت -/۵ ندوۃ المصنفین، جامع مسجد دہلی ۶